

جناب نور محمد غفاری ایم اے

قسط
۲

تفسیر اور علم تفسیر

الغرض ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ تفسیر اور تادیل دونوں ایسے علم ہیں جو قرآنی معارف کی شرح و ایضاح کے لئے ضروری ہے۔ اور دونوں میں اگر فرق ہے تو یہ ہے کہ تفسیر کا لفظ سارے قرآن کی تشریح پر بولا جاسکتا ہے۔ اور تادیل صرف متشابہات کی قبیل سے متعلق آیات کی وضاحت پر یا بعض آیات کے باطنی مفہوم کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اور اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ بعض مفسرین نے اپنی تفاسیر کا نام "تادیل" رکھا ہے۔ مثلاً ابن قتیبہ متوفی ۴۰۵ھ کی "تادیل شکل القرآن" اور ابو منصور رائد متوفی ۳۳۳ھ کی "تادیل القرآن" وغیرہ۔ تو اس کا جواب نہایت سہل ہے کہ "تادیل" کا لفظ غالباً تیسری چوتھی صدی ہجری تک تشریح قرآن کے لئے استعمال ہوتا رہا ہے۔ کیونکہ اس وقت تک عربی زبان کا غلبہ رہا۔ اور ویسے ہی صحیح تابعین کا زمانہ نہایت قریب ہی گذرا تھا۔ لہذا تقریباً تمام امت مسلمہ قرآنی الفاظ اور عبارت کا مفہوم باسانی سمجھ لیتی تھی۔ لہذا مفسرین حضرات صرف مشکل القرآن اور غریب الفاظ یا متشابہات کی تفسیر پر زور دیا کرتے ہیں۔ اور یہ وہ آیات اور الفاظ تھے جن میں ظاہری مفہوم کی بجائے باطنی مفہوم بتانا مقصود تھا۔ لہذا مفسرین حضرات نے اپنی تشریحات کو "تادیل" یا "تادیلات" کا نام دیا۔ (واللہ اعلم بالفتاویٰ)

تفسیر کی ضرورت اور اہمیت

تفسیر کی ضرورت اور اہمیت ثابت کرنے کے لئے جو دلائل دیتے جائیں گے، انہیں ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

۱۔ عقلی دلائل

۲۔ نقلی دلائل

۱۔ نقلی دلائل | انہیں ہم آگے مذکورہ ذیل حصوں میں بانٹ لیتے ہیں۔
 و۔ تفسیر کی ضرورت اور تاکید قرآن حکیم کی روشنی میں۔
 سبب۔ تفسیر کی اہمیت و فضیلت حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں
 ج۔ تعامل صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔
 ح۔ تعامل علماء امت کی روشنی میں۔

۲۔ قرآن مجید کی روشنی میں۔ کتاب اللہ کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قرآن
 کی تشریح و توضیح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک ذمہ داریوں میں سے ایک تھی۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم
 کے چہارگان: قرآن نبوت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

نَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ
 بَعَثَهُ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ
 يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ
 وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ
 (آل عمران: ۱۶۴)
 بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مومنین پر بہت
 بڑا احسان کیا۔ کہ ان میں انہی میں سے ایک
 رسول بھیجا جو ان کو خدا کی آیات سنانا ہے
 ان کا تزکیہ نفس کرتا ہے۔ اور انہیں کتاب
 اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

ان فرامین میں ایک "يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ" اب تعلیم نام صرت الفاظ کے پڑھ دینے کا
 نہیں۔ بلکہ تشریح اور تفسیر کا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَنَقَدْ أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ
 فَلْيُتْلَ مَا نَزَّلَ إِلَيْهِ
 (ملہ: ۴۴)
 ہم نے (اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم) آپ
 پر قرآن نازل کیا تاکہ آپ لوگوں کے سامنے
 اس بات کی وضاحت کریں جو انکی طرف نازل کی
 گئی ہے۔

یہ "تین کلام" تشریح و توضیح کا ہی دوسرا نام ہے۔ ایک اور مقام پر فرمایا۔
 إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ
 لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ
 (نساء: ۱۵۵)
 ہم نے آپ پر حق کے ساتھ کتاب اتاری
 تاکہ آپ لوگوں کے درمیان خدا کی رہنمائی میں
 فیصلہ کریں۔

حاصل کلام، قرآن مجید نے بتایا کہ کتاب اللہ کی تفسیر ضروری ہے۔
 ب۔ حدیث شریفہ کی روشنی میں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن حکیم کی تفسیر

اپنے قول و فعل دونوں سے فرما کر دکھائی اور امت کو تفسیر کا حکم بھی دیا۔ اور فضیلت بنا کر ترغیب بھی دلائی۔ مثلاً

۱۔ سورہ ”حدید“ اور اسکی تفسیر سیکھو۔ (بحوالہ الاتقان ذریعہ ۷۸)

۲۔ حضرت ضحاکؒ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”تِلْكَ تَعَالَى: ”يُوقِي الْحِكْمَةَ“ سے قرآن کا عطا کرنا مراد ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا: ”قرآن کا عطا کرنا سے قرآن کی تفسیر مراد ہے۔ کیونکہ پڑھنے کو تو نیک و بد سبھی پڑھتے ہیں۔“
۳۔ بیہقی وغیرہ نے سیدنا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ ”قرآن مجید کی تعریب (تفسیر) کر دو۔ اور اس کے غریب اور نادر اوصاف الفاظ کی تلاش میں سرگرم رہو۔“

۴۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے حق میں دعا فرمائی :
اللَّهُمَّ فَقِّهْ فِي الدِّينِ وَعَلِّمْهُ اسے اللہ! اسے دین کی فقاہت بخش اور
التَّوْبِيلِ۔ تاویل کا علم عطا فرما۔

تفسیر گویا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک سنت کی پیروی کرنا ہے۔

ج۔ تعامل صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین :۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پھر صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے دور میں بھی تفسیر قرآن کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے مختلف مقالات پر باقاعدہ حلقہ ہائے درس قائم تھے۔ مثلاً مدینہ میں حضرت زید رضی اللہ عنہ اور ان کے شاگرد مکہ مکرمہ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور ان کے تلامذہ راشدہ اور کوفہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کلام اللہ مجید کی تفسیر و تشریح کا فریضہ انجام دیا کرتے تھے۔ اور انہوں نے اپنے شاگردوں کو تفسیر کرنے کا حکم اور ترغیب دی مثلاً :

۱۔ حضرت سعید بن جبیرؒ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا ”جو شخص قرآن شریف پڑھتا ہے۔ اور اس کی تفسیر اچھی طرح نہیں کر سکتا اس کی مثال اس اعرابی کی ہے۔ جو شعر کو بے سوچے سمجھے اور غیر موزوں پڑھتا ہے۔ (مقابل القرآن لابن جریر اللہدی)

۲۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں : ”بیشک مجھے یہ زیادہ پسند ہے کہ میں قرآن کی کسی ایک آیت کی تعریب (تفسیر و توضیح) کروں۔ بہ نسبت اس بات کے کہ میں ایک آیت حفظ کر لوں۔“ (عن الانباری)

اگر کاوش سے کام لیا جائے تو اور بہت اقوال ان حضراتؒ کے مل سکتے ہیں۔

در تعامل علماء امت : صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے بعد تابعین اور تبع تابعین اور ان کے بعد پھر ہر دور میں تفسیر کا عمل برابر جاری رہا اور آج تک جاری ہے۔ علماء نے اپنے عمل اور تحریر و تالیف سے یہ بات ثابت کر دی کہ تفسیر کرنا نہایت ضروری ہے۔ اور اس کے بغیر قرآن کا فہم ممکن نہیں۔ اسی لئے علماء نے تفسیر کرنے کو واجب علی الکفایہ کا درجہ دیا ہے۔

علماء نے بڑی بڑی تفسیر تصنیف کی ہیں۔ مثلاً امام رازیؒ کی ”مفاتیح الغیب“، تفسیر طبری، تفسیر مدارق ذات البہم وغیرہ ان میں سے تفسیر صدائق ذات البہم کے پانچ سو (۵۰۰) اجزاء ہیں۔

۲۔ عقلی دلائل | اور حضرت امام ابن تیمیہؒ کی دلیل : ”اس بات کی تشریح کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو ایسی زبان سے مخاطب کیا ہے جس کو وہ اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اور اسی لئے پروردگار عالم نے ہر ایک رسولؐ کو اس کی قوم کی زبان میں بھیجا ہے۔ اور اپنی کتاب کو بھی اپنی قوموں کی زبان میں نازل فرمایا ہے۔ پھر یہی بات کہ اب تفسیر کی حاجت کیوں رہی؟ تو اس کا جواب ایک قاعدہ کی قرار دلو کہ بعد دیا جائے گا۔ وہ قاعدہ یہ ہے کہ انسانوں میں سے جو شخص کتاب تصنیف کرتا ہے، وہ صرف خود ہی سمجھنے کے لئے تصنیف کرتا ہے۔ اور اس کی کوئی تشریح نہیں کرتا۔ لیکن اس کتاب کی شرح کی حاجت عین وجہ سے پڑتی ہے۔

اول :۔ ان میں سے پہلی بات مصنف کی فصاحت کا کمال ہے کہ وہ علمی قوت کی وجہ سے وجیز لفظوں میں دقیق معنی کو جمع کر دیتا ہے۔ اس لئے بعض اوقات مصنف کی مراد کا سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لہذا ایسی صورت میں شرح سے ان مخفی معنوں کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض علماء نے جو اپنی تصانیف کی شرح خود ہی لکھی ہیں، وہ بہ نسبت ان شرح کے جو دوسرے لوگوں نے لکھی ہیں، بہت زیادہ مراد پر دلالت کرنے والی ہیں۔

دوم :۔ دوسری بات یہ ہے کہ مصنف اپنی کتاب میں چند مسائل کی وضاحت کے لئے کچھ مزید باتیں اور شرطیں اس خیال سے نظر انداز کر دیتا ہے کہ وہ امور اور شروط واضح چیزیں ہیں یا ان کو درج نہیں کرتا کہ ان چیزوں کا تعلق کسی دوسرے علم سے ہوتا ہے۔ لہذا ایسی حالتوں میں شرح کرنے والے کو امر مخدوف اور اس کے مراتب کے بیان کی حاجت پیش آتی ہے۔

سوم :۔ تیسری بات یہ ہے کہ لفظ میں کئی معنوں کا احتمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ مجاز، اشتراک اور دلالت التزام کی صورتوں میں پایا جاتا ہے۔ اور ان صورتوں میں شارح پر لازم ہے کہ وہ مصنف کی غرض کو بیان کرے اور اسے دوسرے معنوں پر ترجیح دے۔

ان تین باتوں کے علاوہ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ بشری تصانیف میں وہ باتیں بھی واقع ہو جاتی ہیں جن سے کوئی بشر غالی نہیں۔ مثلاً تسامح، تکرار اور اسی نوع کے دیگر نقائص۔ لہذا شارح کو ضرورت پیش آتی ہے کہ وہ مصنف کی ان لغزشوں کا بھی اظہار کر دے۔

اب جب یہ بات ٹھیک قرار پاگئی، تو اب ہم کہتے ہیں کہ قرآن حکیم کا نزول محض عربی زبان میں ہوا اور عربی بھی کس دور کی؟ انصاف العرب کے زمانے کی زبان! پھر ان لوگوں کو بھی قرآن کے ظاہر امور اور احکام ہی کا علم ہوتا تھا۔ لیکن اس کے اندر دینی مفہوم کی باریکیاں ان پر اسی وقت منکشف ہوتی تھیں جب وہ بحث و تشخیص سے کام لیتے یا غور و خوض کرتے تھے۔ اور اکثر باتوں کی بابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کرتے تھے۔ مثلاً جس وقت خداوند اقدس کا یہ ارشاد گرامی نازل ہوا: **وَلَسَیْلَیْسُوا اِیْمَانُہُمْ بِعَظِیْمٍ**۔ نازل ہوا تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا۔ ہم میں سے کون ایسا ہے جس نے اپنی جان پر ظلم نہیں کیا۔ (یعنی گناہ کا مرتکب نہیں ہوا) اس وقت بنی صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت کریمہ کے لفظ ”ظلم“ کی تفسیر ”شرک“ کے ساتھ فرمائی اور اس پر دوسری آیت: **اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ** کو بطور دلیل کے پیش کیا۔ یا جیسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ”حَسْبَا بِالْیَسِیْرِ“ کی بابت سوال کیا تھا کہ وہ کیا ہے؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ ”عرض“ (یعنی اعمال کا حرف پیش کرنا) ہے۔ اور جیسے عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کا قصہ ”الْخِیْطُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْخِیْطِ الْاَسْوَدِ“ کے متعلق ہوا۔ اس کے علاوہ اور بہت سی دوسری باتیں ہیں جنہیں صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایک ایک کر کے بنی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تھا۔

اور ہم لوگ بھی ان باتوں کے محتاج ہیں جن کے محتاج حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم تھے۔ علاوہ ازیں ہمیں احکام ظواہر میں سے بھی ایسے امور کے علم کی حاجت کی احتیاج ان حضرات رضی اللہ عنہم کو ہرگز نہ تھی اور ہماری اس احتیاج کا سبب ہمارا بغیر سیکھے ہوئے احکام لغت کے مدارک (فہم) سے قاصر ہونا ہے۔ لہذا ہم کو تمام لوگوں سے بڑھ کر تفسیر کی ضرورت اور حاجت ہے۔

اور یہ بات بھی محتاج بیان نہیں کہ قرآن شریف کے بعض حصہ کی تفسیر صرف وجہ الفاظ کی شرح کرنے اور یہ بات ان کے معنی کو منکشف کر دینے سے ہو جاتی ہے۔ اور بعض مقامات کی تفسیر چند احتمالات میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے سے ہوتی ہے۔ (بحوالہ الاتقان، نوع ۷۸)

۲۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ تمام اشخاص یکساں فہم و فراست، تفکر و تدبیر اور صلاحیت و قابلیت کے نہیں ہوتے، کوئی کچھ فہم ہے تو کوئی زود فہم اور کوئی ذکی ہے۔ تو کوئی باطل غبی۔

اس وجہ سے کسی بات یا کلام کو سمجھنے میں ہر ایک یکساں نہیں ہوتا۔ پھر عام لوگوں کا کلام تو الگ رہا جب معاملہ اللہ تعالیٰ کے کلام کا ہو جس کی جامعیت، بسط، ہمہ گیری اور وسعت کا کچھ ٹھکانہ نہیں جس میں بیشمار مطالب، فصاحت و بلاغت، اوصاف کلام اور معنی و بدیع کا ایک چمن کھلا ہوا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ ایسے کلام کی تشریح و تفسیر ایک ضروری چیز ہے۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ استفادہ کر سکیں۔

۳۔ پھر قرآن ایک پہلو سے اصول و کلیات کی کتاب ہے۔ جس میں جزئیات نگاری سے کام نہیں لیا گیا۔ اور نہ ہی اس میں فروعی باتوں کو کھپانے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ ان اصولی و کلیات کی تشریح اور جزئیات و تفصیلات کی تبتین و تفسیر ضروری ہو جاتی ہے۔ پھر قوانین و احکام کی تفصیلی صورت، حدود و قیود اور ان کا اطلاق واضح طور پر متعین ہونا چاہیے۔ اور اس ضرورت کو تفسیر پورا کرتی ہے۔

الغرض، مندرجہ بالا عقلی اور نقلی دلائل کی روشنی میں یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ قرآن حکیم کی تفسیر کس قدر ضروری ہے۔ اس کے ذریعے ہی ہمیں اس کتاب مقدس کا فہم حاصل ہوگا جس میں ہماری نبوی و اخروی فوز و فلاح کا راز پنہاں ہے۔

ہماری ★ ڈی۔ ڈی۔ ٹی
مصنوعات ★ ہائیڈوکلورک الیڈ
★ پیرا ڈائی کلورو بنزین

ملک کی مصنوعات کی سرپرستی کیجئے

منجانب :- ڈی۔ ڈی۔ ٹی فیکٹری

جدید زبانوں

محترم جناب منظر عباسی - (مری)

(۲)

عربی لفظ

لفظ ایک زبان سے بڑھ کر کے دوسری زبان میں جاتا ہے تو اس کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے؟ اور اسکی صورت کس طرح مسخ کی جاتی ہے؟ اس کا اندازہ عربی کے لفظ "امیر" سے کیا جاسکتا ہے۔

امیر | امیر عربی لفظ ہے۔ اس کے معنی ہیں صاحب امر یعنی حاکم، انچارج، نگراں وغیرہ۔ پھر صاحب امر یعنی حاکم مال و دولت کا مالک بھی ہوتا ہے۔ اس نسبت سے اردو میں امیر مالدار، جنوں میں استعمال کیا جانے لگا۔ یعنی اردو والوں نے لفظ کے مفہوم میں تبدیلی باوجود یہ کہ اسکی صورت مسخ نہیں کی۔ البتہ اہل یورپ نے اس کا علیحدہ لگا دیا ہے۔

مسلمان یورپ میں سپین کے راستے گئے تھے۔ اور سپین فتح کرنے کیلئے مسلمانوں نے ہر روم کو عبور کیا تھا۔ گویا مسلمانوں کی بحری فوج نے سپین فتح کیا۔ اور اسی فوج کے مجاہدوں نے سپین میں کامیاب ہوئے تھے۔ ان مجاہدوں کا سپہ سالار بحری فوج کا کمانڈر "امیر البحر" کہلاتا تھا۔ اس نے "امیر البحر" کی اصطلاح اپنائی اور اس سے "بحر" حذف کر دیا۔ "بحر" کا لفظ عربی کے بعد انہیں صرف میر کا لفظ اپنانا چاہئے تھا۔ لیکن عربی زبان سے واقف نہ ہوئے۔ انہوں نے "بحر" کے شروع میں واقع "ال" امیر کے ساتھ جوڑ کر "امیرال" بنالیا اور اس کی سی زبان میں بحری فوج کے نگران کو AMIRAL (امیرال) کہا جانے لگا۔ انیسویں صدی کے عربوں نے یہ لفظ اپنا، تو انہوں نے شروع شروع میں صرف "ال" فرانس کو نقل پر اکتفا کیا۔ AMIRAL (امیرال) ہی بولتے اور لکھتے رہے۔ چنانچہ پرانی انگریزی میں یہ لفظ ملتا ہے۔ اور اسکی صورت مسخ کر کے اسے ADMIRAL (ایڈمرال) بنا دیا اور آج کا بحری فوج کے

نگران یا صاحب امر کے لئے ADMIRAL (ایڈمیرال) مستعمل ہے۔

عمر فرمایا آپ نے کہ فرانس والوں نے لفظ کی صورت اس طرح بدلی کہ "بحر" کے شروع میں کلمہ تعریف یعنی "ال" واضح تھا اسے اپنی ناسمجھی کے باعث "امیر" کے آخر میں جوڑ دیا۔ اور "امیر" کو "امیرال" بنا ڈالا۔ اور فرانس والوں سے انگلینڈ والوں نے جب یہ کلمہ مستعار لیا۔ تو اس میں "ایڈ" کا اضافہ کر کے ایڈمیرال (ADMIRAL) بنا دیا۔

معنوی اعتبار سے بھی تعریف کی گئی ہے۔ اور وہ یہ کہ "امیرال" یا "ایڈمیرال" ہر قسم کے نگران، سردار، یا صاحب امر کے لئے نہیں بلکہ صرف بحری فوج کے نگران اعلیٰ کے لئے مخصوص کر دیا ہے۔ حالانکہ جب لفظ بحر حذف کر دیا تھا۔ تو اس لفظ کی عمومیت باقی رہنی چاہئے تھی۔ اور نہ صرف فوج بلکہ ہر شعبہ کے نگران کو "امیر" یا "ایڈمیرال" کہنا چاہئے تھا۔

جبل الطارق اسپین، امیر البحر، اور مسلمانوں کی بحری فوج کے ذکر سے ایک اور لفظ یاد آیا۔ جسکی اہل یورپ نے صورت سن کر کے ایک مثال اور نمونہ فراہم کیا ہے۔ یہ ہے "جبل الطارق" پرانے اندلس اور موجودہ اسپین کے جنوبی ساحل پر ایک شہر آباد ہے، جس کا نام GIBRALTAR (جبرالٹر) ہے۔ یہ عربی لفظ جبل اور "طارق" کا مرکب ہے۔ یعنی طارق کا پہاڑ۔ یہ وہ پہاڑی مقام ہے جہاں طارق بن زیاد کی سرکردگی میں مسلمانوں کی بحری فوج نے سرزمین اندلس میں پہلی چھاؤنی بسائی تھی۔

اہل یورپ نے "جبل الطارق" کی صورت سن کر اسے GIBRALTAR (جبرالٹر) بنا لیا ہے۔ یہ لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ انہوں نے یہ لفظ عربی کے جبل الطارق سے لیا ہے، لیکن کسی قاعدے قانون کی نشاندہی نہیں کر سکتے جس کے مطابق "جبل" کو "جبرال" اور "طارق" کو "ٹر" بنا لیا ہے۔ غالباً "امیر البحر" کی طرح "جبل الطارق" میں "ال" سے "ال" جبل کے ساتھ لگا لیا گیا ہے۔ اور جبل کے "ل" کو "ر" سے بدل ڈالا ہے۔ اس طرح جبل "جبرال" بن گیا۔ باقی رہا "طارق" سو اس کا "ق" حذف کر کے "طار" باقی رکھا۔ جو تلفظ میں TAR یعنی تار اور پھر "ٹر" بن گیا۔

"ل" اور "ر" (یا اور R) کا آپس میں ایک دوسرے سے بدل جانے کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ خود عربی میں "سیر" اور "سیل" دو لفظ ہیں جن میں "ر" اور "ل" کا فرق ہے۔ اور معنی کم و بیش ایک ہیں۔ ہمارے ہاں اردو میں "سیر" کا اسم فاعل "سیلانی" مستعمل ہے۔ اگر "ر" اور "ل" آپس میں نہ بدلتے تو یا "سیر" کا اسم فاعل "سیرانی" ہوتا یا سیلانی کا مادہ "سیل" ہوتا۔

حشیش | حشیش عربی میں جھنگ کو کہتے ہیں۔ جھنگ نشہ آور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ

قاتلوں کی ایک جماعت تھی جس کے افراد شیش یعنی بھنگ پی کر قتل و غارت کیا کرتے تھے۔ ان لوگوں کو ”شیش“ یعنی ”بھنگ“ والے کہا جاتا تھا۔

صلیبی جنگوں میں اہل یورپ نے مسلمان مجاہدوں کو بے جگر ہی اور بہادری سے رٹتے دیکھا تو کہنے لگے کہ یہ لوگ بھنگ پی کر بڑے ہیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ ہر اس شخص کے بارے میں شیش کا لفظ استعمال کیا جانے لگا جو قتل و غارت کا مظاہرہ کرنا۔ پھر یہ لفظ قتل کے معنوں میں اہل یورپ نے اپنایا۔ اور شیشین ”جو شیش سے جمع تھا، واحد فرض کر لیا۔ اور اسکی صورت ASSASSIN (اساسین) بن گئی۔ اب اہل یورپ نے اپنی زبان میں مزاج کے مطابق اس میں رد و بدل کر کے اس سے حسب ذیل کلمات بنائے

ASSASSIN (اساسین) قاتل

ASSASSINATION (اساسی نیشن) قتل

ASSASSINATE (اساسی نیٹ) قتل کرنا

ASSASSINATED (اساسی نیٹڈ) مقتول

ASSASSINATOR (اساسی نیٹر) قاتل

شیش سے ایک اور لفظ یاد آیا جسے اہل یورپ نے بگاڑا ہے۔ اور وہ ہے ”شرقیین“ جو ”شرقی“ کی جمع ہے۔

شرقیین | شرقیین عربی لفظ ہے جو مشرق کی طرف منسوب ہے۔ اور جمع ہے۔ جن ممالک میں اسلام کی پہلے پہل اشاعت ہوئی اور جن ملکوں سے مسلمان مجاہدوں نے شروع شروع میں علم جہاد بلند کیا تھا۔ وہ سب ملک براعظم یورپ کے مشرق میں واقع ہیں۔ اس نسبت سے یورپ والوں نے مسلمانوں کو مشرقی لوگ کہنا شروع کر دیا۔

”مشرقی لوگ“ ایک اصطلاح بن گئی تھی جس کیلئے عربی میں لفظ مشرقیین تھا۔ یونانیوں نے سب سے پہلے شرقیین کی اصطلاح استعمال کی اور مسلمانوں کو SARACENOS (ساراکنی نوس) کہنے لگے غالباً یونانیوں نے یہ لفظ ”شرقیین“ سے لیا تھا۔ جو ”شرقیین“ ہی کی ایک صورت ہے۔ یونانی زبان سے یہ لفظ لاطینی زبان میں گیا تو اسکی املا SARACENUS (ساراکنی نوس) ہو گئی۔ گویا یونانی لفظ میں K (ک) تھا۔ اور لاطینی میں C (ک) ہو گیا۔ یہ صرف املا کی تبدیلی تھی۔

تلفظ میں فرق نہ تھا۔ اس لئے کہ لاطینی میں C (ک) کی آواز دیتا ہے۔ لاطینی سے یہ لفظ